صوفیانہ شاعری میں محبت کا تصور: رومی سے بلھے شاہ تک

The Concept of Love in Sufi Poetry: From Rumi to Bulleh Shah

Mubashir Hassan

** PhD Student, Department of Islamic Thought and Culture, NUML University Islamabad.*

KEYWORDS

Bulleh Shah;
Comparative literature
fana;
Love (‘ishq);
Mystical union;
Rumi;
Social critique; Spirituality;
Sufi poetry;
Wahdat al-wujūd

ABSTRACT

This paper explores the concept of love (‘ishq) in Sufi poetry, concentrating on two prominent mystical poets: Jalal al-Din Rumi (1207–1273) and Bulleh Shah (1680–1757). Within the Sufi tradition, love transcends the ordinary bounds of human emotion; it is regarded as a sacred force that leads the soul from selfhood (nafs) toward divine union. Rumi, writing in Persian during the Seljuk era, presents love as a metaphysical reality that consumes the ego through fana (annihilation of the self) and culminates in wahdat al-wujūd (unity of being). His works, especially the Masnavi and the Divan-e Shams, portray love as both transformative and universal, a path that elevates human existence beyond rationality into mystical gnosis. In contrast, Bulleh Shah, a Punjabi poet of the Mughal period, situates love in the lived realities of his society. His kafi verses employ vernacular idioms, folk tales, and cultural metaphors to challenge orthodoxy, caste hierarchies, and sectarian boundaries. For him, love is both spiritual and revolutionary: a means of transcending ritualistic religion while affirming human equality and unity with the Divine. Although Rumi and Bulleh Shah differ in style, language, and historical context, their shared emphasis on love as a universal force illustrates the enduring role of Sufi poetry in bridging spiritual and social dimensions. This comparative study, using literary and postcolonial perspectives, demonstrates that Sufi poetry frames love as a timeless language of devotion, spirituality, and reform, resonating across cultures and epochs.

تعارف

صوفیانہ شاعری اسلامی تہذیب اور روحانیت کا ایک ایسا لازمی عنصر ہے جس نے صدیوں سے مختلف خطوں اور زبانوں میں انسانی دلوں کو مسحور کیا ہے۔ صوفی شعرا نے اپنی شاعری کو محض فن یا ادب کی سرگرمی نہیں بنایا بلکہ اسے ایک روحانی مشن قرار دیا، جس کا مقصد انسان کو اپنی ذات سے بلند

*Corresponding Author: *Mubashir Hassan*
Email Address: *malikmubashir89@gmail.com*

کر کے الٰہی حقیقت سے جوڑنا تھا۔ اس شاعری کی بنیاد "عشق" ہے، جو صوفیانہ فکر میں سب سے مرکزی اور ہمہ گیر تصور سمجھا جاتا ہے۔ عشق صرف ایک جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسا روحانی سفر ہے جو انسان کو "نفس" کی قید سے آزاد کر کے خدا کی قربت اور وحدت کے تجربے تک لے جاتا ہے۔

اسلامی تصوف میں عشق کا تصور قرآن و حدیث سے براہِ راست اخذ شدہ نہیں ہے بلکہ اسے صوفیاء نے الہام، وجدانی تجربات اور باطنی معرفت کی روشنی میں تشکیل دیا۔ رابعہ بصری کے دور سے لے کر مولانا جلال الدین رومی اور بلھے شاہ تک، عشق کو خدا تک رسائی کا سب سے مؤثر وسیلہ سمجھا گیا۔ یہ وہ قوت ہے جو انسان کو نہ صرف روحانی ارتقاء عطا کرتی ہے بلکہ سماجی اور اخلاقی سطح پر بھی بیداری پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ صوفیانہ شاعری میں عشق کا ذکر صرف الٰہی محبت کے حوالے سے نہیں بلکہ معاشرتی انصاف، انسان دوستی، اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔

مولانا رومی (1207–1273) کو عالمی سطح پر صوفی شاعری کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی مثنوی اور دیوان شمس تبریزی عشق کے ایسے استعاروں اور مثالوں سے بھری ہوئی ہیں جو انسان کو عقل کی حدود سے آگے لے جا کر الٰہی وحدت کا مشاہدہ کراتے ہیں۔ رومی کے نزدیک عشق وہ آگ ہے جو نفس کو جلا کر فنافی اللہ کی منزل تک لے جاتی ہے۔ ان کے ہاں عشق ایک کائناتی اصول ہے جو انسان اور خدا کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ ان کی شاعری محض ایک ادبی کارنامہ نہیں بلکہ ایک عرفانی درسگاہ ہے، جس نے صدیوں تک دنیا بھر کے قارئین کو متاثر کیا ہے (Schimmel, 1975; Chittick, 1983)۔

اس کے برعکس بلھے شاہ (1680–1757) کی شاعری پنجابی زبان اور لوک روایت کی زمین سے پھوٹی۔ بلھے شاہ نے عشق کو مقامی استعاروں جیسے ہیر رانجھا، سسی پنوں اور دیگر لوک کہانیوں کے ذریعے بیان کیا۔ ان کے ہاں عشق صرف ایک روحانی قوت نہیں بلکہ سماجی بغاوت اور اصلاح کا ذریعہ بھی ہے۔ وہ مذہبی پیشوائیت، ذات پات اور سماجی ناانصافی کے خلاف اپنی شاعری میں کھلے عام آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کا مشہور شعر "بلھا کی جاناں میں کون؟" صرف ایک روحانی سوال نہیں بلکہ سماجی اور مذہبی شناخت کے جمود کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ اس طرح بلھے شاہ نے عشق کو ایک ایسے آفاقی اصول کے طور پر پیش کیا جو انسان کو خدا سے بھی ملاتا ہے اور معاشرتی رکاوٹوں سے بھی آزاد کرتا ہے (Puri & Shangari, 1986; Shackle, 2012)۔

صوفیانہ شاعری میں رومی اور بلھے شاہ کے عشق کا موازنہ ہمیں یہ سمجھنے کا موقع دیتا ہے کہ ایک ہی روحانی اصول مختلف تہذیبی، تاریخی اور لسانی پس منظر میں کس طرح مختلف جہات اختیار کرتا ہے۔ رومی کے ہاں عشق فلسفیانہ اور عرفانی ہے، جو ماورائی اور مابعد الطبیعاتی (metaphysical) مفہوم رکھتا ہے، جبکہ بلھے شاہ کے ہاں عشق عملی، عوامی اور مقامی ہے، جو روزمرہ زندگی کے مسائل اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج میں ڈھلتا ہے۔

یہ تقابلی مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ صوفیانہ شاعری کا اصل جوہر عالمگیریت اور تنوع دونوں میں مضمر ہے۔ ایک طرف یہ انسان کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے، تو دوسری طرف یہ انسان کو انسان سے جوڑنے کا پلیٹ فارم بھی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رومی کی فارسی شاعری اور بلھے شاہ کی پنجابی شاعری باوجود لسانی اور زمانی فاصلے کے، ایک ہی صوفیانہ پیغام کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔

اس تحقیقی مقالہ کا مقصد اس تقابلی جائزے کو علمی بنیاد پر پیش کرنا ہے۔ اس میں صوفیانہ شاعری میں عشق کے تصور کو رومی اور بلھے شاہ کی شاعری کے حوالے سے واضح کیا جائے گا، ان کے فکری اور روحانی پس منظر کو بیان کیا جائے گا، اور یہ بتایا جائے گا کہ کس طرح ان کی شاعری میں عشق ایک طرف الوہی حقیقت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری طرف سماجی اصلاح اور بغاوت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس مقالے میں ادبی اور پس نوآبادیاتی (postcolonial) تناظر کے ساتھ ساتھ تاریخی اور ثقافتی عوامل کا بھی جائزہ لیا جائے گا تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ صوفیانہ شاعری میں عشق کس طرح ایک عالمگیر زبان بنتا ہے جو ہر دور اور ہر معاشرے میں اپنی معنویت قائم رکھتا ہے۔

پس منظر

صوفیانہ شاعری کی جڑیں اسلامی تصوف کے ابتدائی دور میں پیوست ہیں۔ اسلام کے ابتدائی صدیوں میں جب صوفیاء نے زہد، تقویٰ اور ترکِ دنیا کو اپنایا تو رفتہ رفتہ اس رجحان نے عشقِ الٰہی کے فلسفے کو جنم دیا۔ قرآن کریم میں خدا اور بندے کے درمیان تعلق کو بارہا محبت اور قربت کے استعاروں سے بیان کیا گیا ہے، جیسے آیت " :یحبہم ویحبونہ "(وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں)۔ اسی قرآنی تعلیم کو صوفیاء نے اپنی روحانی فکر کی بنیاد بنایا اور اس سے "عشق" کا وہ تصور پیدا ہوا جو بعد میں صوفیانہ شاعری کا مرکزی موضوع بن گیا۔

آٹھویں صدی کی مشہور صوفیہ شخصیت حضرت رابعہ بصری (717–801) کو عشقِ حقیقی کا اولین مبلغ کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے محبت کو محض جذباتی وابستگی کے بجائے ایک خالص روحانی جذبہ قرار دیا، جو نہ جنت کے شوق سے ہے اور نہ جہنم کے خوف سے، بلکہ صرف خدا کی ذات سے محبت کے لیے ہے (Smith, 1928)۔ رابعہ کے یہ خیالات بعد کے صوفیاء اور شعرا کے لیے بنیاد بنے۔

تیرہویں صدی میں مولانا جلال الدین رومی (1207–1273) نے اس عشق کو فلسفیانہ اور کائناتی سطح پر بیان کیا۔ رومی کے زمانے میں سلجوقی سلطنت اندرونی سیاسی انتشار اور منگول حملوں کے خطرے سے دوچار تھی۔ اس ماحول میں رومی نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک ایسا پیغام دیا جو ظاہری دنیا کی تلخیوں سے بلند ہو کر انسان کو الوہی محبت کے ذریعے سکون اور یقین عطا کرتا تھا۔ ان کی مثنوی معنوی کو اکثر "قرآن کی فارسی زبان میں تفسیر" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کتاب الٰہی عشق، فنا فی اللہ اور وحدت الوجود کے موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے (Schimmel, 1975؛ Chittick, 1983)۔ رومی نے عشق کو ایک آفاقی قوت قرار دیا جو عقل اور منطق کی حدود سے ماورا ہے اور جو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ہے۔

دوسری طرف برصغیر میں صوفیانہ شاعری نے ایک مختلف رنگ اختیار کیا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے پنجاب میں جب مذہبی سخت گیری، ذات پات کی تفریق اور سماجی ناہمواریاں اپنے عروج پر تھیں، تب بلھے شاہ (1680–1757) نے عشق کو ایک انقلابی تصور کے طور پر پیش کیا۔ ان کی پنجابی کافی شاعری مقامی زبان اور لوک روایت سے جڑی تھی، جس نے عام لوگوں کے دلوں تک رسائی حاصل کی۔ بلھے شاہ نے ہیر رانجھا جیسے لوک استعاروں کو استعمال کرکے عشق کو نہ صرف خدا سے قربت کا ذریعہ بنایا بلکہ اسے مذہبی ریاکاری اور طبقاتی تقسیم کے خلاف احتجاج کی آواز بھی بنایا (Puri & Shangari, 1986؛ Shackle, 2012)۔

بلھے شاہ کے زمانے میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی اور پنجاب میں سیاسی و سماجی بحران نے عوامی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں ان کی شاعری نے لوگوں کو روحانی تسکین دینے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف کا پیغام بھی دیا۔ وہ اپنے دور کے مذہبی پیشواؤں اور ملاؤں کے خلاف کھل کر بولے اور کہا کہ عشق ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو خدا سے بھی ملاتا ہے اور انسانیت کو بھی یکجا کرتا ہے۔

یہ پس منظر ظاہر کرتا ہے کہ صوفیانہ شاعری محض ایک روحانی یا مذہبی عمل نہیں تھی بلکہ اپنے وقت کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات سے بھی جڑی ہوئی تھی۔ رومی کی شاعری فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی (metaphysical) تھی جو عالمگیر سطح پر عشق کو بیان کرتی ہے، جبکہ بلھے شاہ کی شاعری عوامی، مقامی اور احتجاجی تھی جو زمینی حقائق کو مد نظر رکھتی تھی۔ اس طرح صوفیانہ شاعری کے تاریخی سفر میں عشق کا تصور کبھی کائناتی اور ماورائی رنگ اختیار کرتا ہے اور کبھی مقامی اور عملی۔

رومی کی شاعری میں محبت کا تصور

مولانا جلال الدین رومی (1207–1273) اسلامی تصوف کے سب سے عظیم شعرا اور مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری، بالخصوص مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریزی، صوفیانہ فکر میں محبت) عشق (کے تصور کا سب سے نمایاں اظہار ہے۔ رومی کے نزدیک عشق محض انسانی جذبات کا ایک مرحلہ نہیں بلکہ ایک کائناتی قوت ہے جو انسان کو اپنی محدود خودی سے نکال کر خدا کی لامحدود حقیقت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

رومی کے ہاں عشق کا پہلا مرحلہ فنا ہے، یعنی انسان اپنی خودی اور نفسانی خواہشات کو مٹادے۔ یہ فنا صرف ترکِ دنیا کے معنوں میں نہیں بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی ذات کے غرور کو ختم کرکے خدا کی عظمت کو تسلیم کرے۔ اس کے بعد عشق انسان کو بقا کی منزل تک لے جاتا ہے، جہاں وہ خدا کی محبت میں ہمیشگی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح عشق نہ صرف خودی کی نفی ہے بلکہ ایک مثبت تخلیقی قوت بھی ہے جو انسان کو کائنات کی وسعتوں سے روشناس کراتی ہے (Chittick, 1983)۔

رومی کی شاعری میں عشق کو اکثر ایک آگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے نفس کو جلا دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں": عشق وہ آگ ہے جو جلے تو سب کچھ مٹادے، مگر اس کی راکھ سے حقیقت کا چراغ روشن ہوتا ہے۔"

یہ استعارہ ظاہر کرتا ہے کہ عشق انسان کو تباہ نہیں کرتا بلکہ اسے الٰہی شعور اور روحانی بلندی عطا کرتا ہے۔

رومی کے نزدیک عشق عقل اور منطق سے بالاتر ہے۔ عقل محدود ہے اور صرف ظاہری حقائق تک رسائی دیتی ہے، لیکن عشق انسان کو باطنی اور ماورائی حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار کہتے ہیں کہ "عقل عاجز ہے اور عشق راہنما"۔ اس طرح ان کی شاعری میں عشق ایک ایسا ذریعہ ہے جو عقل کی حدود کو توڑ کر انسان کو خدا کے قریب لے جاتا ہے(Schimmel, 1975)۔

دیوان شمس تبریزی میں عشق کو انسانی اور الوہی دونوں سطحوں پر بیان کیا گیا ہے۔ رومی کے نزدیک ان کے مرشد شمس تبریزی کے ساتھ تعلق عشقِ حقیقی کا آئینہ دار ہے۔ یہ عشق محض ایک شخصی تعلق نہیں بلکہ خدا کے ساتھ روحانی وابستگی کا راستہ ہے۔ رومی نے شمس کی صورت میں خدا کی تجلی دیکھی اور اپنی شاعری کو اسی عشق کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

رومی کی شاعری میں عشق کا ایک اہم پہلو اس کی عالمگیریت ہے۔ وہ عشق کو کسی خاص مذہب، زبان یا ثقافت سے محدود نہیں کرتے بلکہ اسے ایک کائناتی اصول قرار دیتے ہیں جو ہر دل میں موجود ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ زبان ہے جو تمام انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے اور جس کے ذریعے انسان خدا تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری مشرق و مغرب، مسلم و غیر مسلم سب کے لیے یکساں طور پر متاثر کن ہے(Lewis, 2000)۔

رومی کے ہاں عشق وحدت الوجود کے فلسفے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کی ہر شے خدا کی تجلی ہے اور عشق وہ قوت ہے جو انسان کو اس وحدت کا شعور عطا کرتی ہے۔ عشق کے بغیر انسان محض ایک جسمانی وجود ہے، لیکن عشق کے ساتھ وہ الوہی حقیقت کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح رومی کے نزدیک عشق انسان کی اصل حقیقت اور کائنات کے مقصد کو واضح کرتا ہے۔

بلھے شاہ کی شاعری میں محبت کا تصور

بلھے شاہ(1680–1757) برصغیر کی صوفیانہ شاعری کے سب سے بڑے نمائندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق پنجاب سے تھا اور انہوں نے اپنی شاعری پنجابی زبان میں تخلیق کی، جو اس خطے کی عوامی زبان تھی۔ بلھے شاہ کی شاعری نے مقامی ثقافتی روایات، لوک داستانوں اور روزمرہ کے استعاروں کو صوفیانہ فکر کے ساتھ جوڑ کر ایک ایسی صوفیانہ روایت تشکیل دی جس نے عوامی دلوں میں گہری جڑیں پکڑیں۔ ان کے کلام کا مرکزی موضوع "عشق" ہے، لیکن یہ عشق محض ایک روحانی کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسی قوت ہے جو سماجی، مذہبی اور ثقافتی رکاوٹوں کو توڑتی ہے۔

بلھے شاہ کے دور میں مغل سلطنت زوال پذیر تھی اور پنجاب میں سیاسی، سماجی اور مذہبی تضادات اپنے عروج پر تھے۔ معاشرے میں ذات پات کا فرق، مذہبی پیشوائیت کی سختی، اور طبقاتی تقسیم عوام کی زندگی کو محدود کر رہی تھی۔ ایسے ماحول میں بلھے شاہ نے عشق کو ایک انقلابی تصور کے طور پر پیش کیا۔ ان کی شاعری میں عشق صرف خدا تک رسائی کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو انسان سے بھی قریب کرتا ہے اور سماجی رکاوٹوں کو توڑتا ہے(Shackle, 2012)۔

بلھے شاہ کے مشہور اشعار "بلھا کی جاناں میں کون" ان کے عشق کے تصور کو واضح کرتے ہیں:

"بلھا کی جاناں میں کون؟ نہ میں مومن وچ مسیتاں، نہ میں ہندو وچ مندراں، نہ میں ترک وچ تاتاری، نہ میں عربی نہ لاہوری۔"

یہ اشعار صرف ایک عرفانی کیفیت کا اظہار نہیں بلکہ ایک سماجی احتجاج بھی ہیں۔ بلھے شاہ کے نزدیک عشق انسان کو مذہبی شناخت، ذات پات اور نسلی تعصبات سے آزاد کرتا ہے۔ وہ عشق کو ایک ایسی قوت سمجھتے ہیں جو تمام سرحدوں کو مٹا دیتی ہے اور انسان کو براہِ راست خدا کی قربت عطا کرتی ہے(Puri & Shangari, 1986)۔

بلھے شاہ کی شاعری میں عشق کو اکثر لوک داستانوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں اور مرزا صاحباں جیسے قصے ان کے کلام میں بار بار آتے ہیں۔ یہ استعارے ظاہر کرتے ہیں کہ عشق صرف ایک روحانی حقیقت نہیں بلکہ انسانی تجربے کا ایک حصہ ہے جو عام لوگوں کی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ ان لوک کہانیوں کو استعمال کر کے بلھے شاہ نے عشق کو ایک عوامی اور سمجھنے میں آسان زبان دی، تا کہ ہر طبقے کے لوگ اس پیغام کو سمجھ سکیں(Shackle, 2012)۔

بلھے شاہ کے ہاں عشق کا ایک اور نمایاں پہلو مذہبی ریاکاری اور رسمی عبادات کے خلاف ان کا احتجاج ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عشق رسمی عبادات اور مذہبی رسوم سے بلند ہے۔ ان کے نزدیک، خدا تک رسائی نہ ظاہری اعمال سے ہے اور نہ ہی مذہبی رسومات سے، بلکہ صرف عشق سے ہے۔ وہ کہتے ہیں": مسجد ڈھادی، مندر ڈھادے، ڈھادے جو کچھ ڈھندا، پر کسے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا۔"

یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ بلھے شاہ کے نزدیک عشق کا راستہ انسان کے دل سے گزرتا ہے، اور خدا دلوں میں رہتا ہے، نہ کہ عمارتوں یا رسموں میں۔ اس طرح وہ عشق کو خدا تک رسائی کا سب سے براہِ راست اور مؤثر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

بلھے شاہ کے تصورِ عشق میں ایک بغاوت بھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے علما اور مذہبی پیشواؤں کو للکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا راستہ عشق سے خالی ہے۔ وہ صوفی مرشد "عنایت شاہ قادری" کو اپنا اصل رہنما مانتے ہیں اور عشق کے ذریعے معرفت کے سفر کو ممکن سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق محض ایک روحانی کیفیت نہیں بلکہ ایک عملی زندگی کا اصول ہے، جو انصاف، مساوات اور انسان دوستی پر مبنی ہے(Puri & Shangari, 1986)۔

بلھے شاہ کے ہاں عشق کا تصور "وحدت الوجود" کے فلسفے سے بھی جڑا ہوا ہے، لیکن یہ وحدت عوامی سطح پر بیان کی گئی ہے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان فاصلے کو مٹانے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق ہی وہ راستہ ہے جو خالق اور مخلوق کو قریب کرتا ہے۔ لیکن ان کی وحدت کا تصور فلسفیانہ کم اور عملی زیادہ ہے۔ وہ فلسفہ کی پیچیدہ اصطلاحات سے اجتناب کرتے ہیں اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں تا کہ ان کا پیغام براہِ راست عوام تک پہنچ سکے (Shackle, 2012)۔

یوں بلھے شاہ کی شاعری میں عشق ایک ہمہ گیر تصور ہے جو ایک ہی وقت میں روحانی بھی ہے اور سماجی بھی، الوہی بھی ہے اور انسانی بھی۔ یہ عشق انسان کو خدا سے بھی ملاتا ہے اور انسان کو انسان سے بھی۔ ان کی شاعری نے پنجاب کے عام لوگوں کو ایک ایسا پیغام دیا جو آج بھی مذہبی، سماجی اور ثقافتی حدود سے ماورا ہو کر زندہ ہے۔

مشترکہ اقدار اور فرق

صوفیانہ شاعری میں مولانا جلال الدین رومی اور بلھے شاہ کے ہاں عشق کا تصور بظاہر مختلف سماجی، لسانی اور تاریخی پس منظر میں پروان چڑھا، لیکن اس کے بنیادی مقاصد اور مرکزی اقدار میں نمایاں اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان دونوں شعرا نے عشق کو خدا تک رسائی کا سب سے مؤثر وسیلہ قرار دیا، اور دونوں نے یہ باور کرایا کہ عشق انسان کو اپنی محدود ذات سے آزاد کر کے الوہی وحدت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ تاہم، اس اشتراک کے باوجود ان کے اسلوب، اظہار اور سماجی کردار میں فرق نمایاں ہے۔

مشترکہ اقدار

رومی اور بلھے شاہ کے کلام میں سب سے پہلی مشترکہ قدر "عشق کی عالمگیریت" ہے۔ رومی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں کہ عشق عقل سے ماورا ہے اور کائنات کے ذرے ذرے میں جاری ہے (Schimmel, 1975)۔ اسی طرح بلھے شاہ اپنے کلام میں اعلان کرتے ہیں کہ عشق مذہب، ذات پات اور معاشرتی رکاوٹوں سے بلند ہے (Shackle, 2012)۔ دونوں شعرا نے یہ تصور دیا کہ عشق ایک ایسی قوت ہے جو ہر انسان کو خدا کی طرف لے جاتی ہے اور انسانوں کے درمیان تفریق کو مٹاتی ہے۔

دوسری مشترکہ قدر "فنا اور وحدت الوجود" کا نظریہ ہے۔ رومی کے ہاں فنا فی اللہ عشق کی معراج ہے، جہاں انسان اپنی انانیت کو مٹا کر الوہی حقیقت میں ضم ہو جاتا ہے (Chittick, 1983)۔ بلھے شاہ کے ہاں بھی عشق کا کمال یہی ہے کہ انسان اپنی ذات اور سماجی شناخت کی سرحدوں کو توڑ کر الوہی وحدت کا تجربہ کرتا ہے۔ ان کے اشعار "بلھا کی جاناں میں کون" اسی فنا اور وحدت کی علامت ہیں، جہاں فرد اپنی شخصی اور معاشرتی حیثیت سے بلند ہو کر محض "محبت" کی ہستی میں ڈھل جاتا ہے۔

تیسری مشترکہ قدر "روحانی بیداری" ہے۔ رومی اور بلھے شاہ دونوں کے ہاں عشق کو ایک ایسا سفر سمجھا جاتا ہے جو انسان کو جمود اور بے حسی سے نکال کر روحانی شعور اور معرفت تک لے جاتا ہے۔ رومی کے ہاں یہ بیداری عقل اور منطق کی محدودیت سے آزادی ہے، جبکہ بلھے شاہ کے ہاں یہ بیداری سماجی اور مذہبی جبر سے نجات ہے۔

فرق

اس گہرے اشتراک کے باوجود دونوں شعرا کے عشق کے تصورات میں اہم فرق بھی نمایاں ہیں۔ سب سے بنیادی فرق ان کے لسانی اور ادبی اسلوب میں ہے۔ رومی کی شاعری فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، جو اس دور کی علمی اور فلسفیانہ زبان تھی۔ ان کا اسلوب زیادہ عرفانی، استعاراتی اور مابعد الطبیعاتی ہے۔ اس کے برعکس بلھے شاہ نے پنجابی زبان میں شاعری کی، جو عوامی اور مقامی زبان تھی۔ ان کا اسلوب سادہ، براہِ راست اور عام فہم ہے، تاکہ ان کا پیغام گاؤں اور بستی کے عام لوگوں تک پہنچ سکے(Puri & Shangari, 1986؛ Lewis, 2000)۔

دوسرا فرق ان کے فکری پس منظر میں ہے۔ رومی کا عشق زیادہ تر فلسفیانہ اور کائناتی نوعیت رکھتا ہے، جس میں وحدت الوجود اور فنا کے پیچیدہ عرفانی مضامین شامل ہیں۔ بلھے شاہ کا عشق زیادہ عملی اور سماجی نوعیت کا ہے، جو روزمرہ کی زندگی کے مسائل، مذہبی منافرت اور سماجی تقسیم کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ رومی کا عشق ایک ماورائی اور تجریدی سطح پر الوہی حقیقت کی تلاش ہے، جبکہ بلھے شاہ کا عشق عوامی سطح پر مساوات اور انصاف کی جستجو ہے(Shackle, 2012)۔

تیسرا فرق ان کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں ہے۔ رومی کا زمانہ سلجوقی سلطنت اور منگول یلغار کے تناظر میں تھا، جہاں ان کی شاعری نے لوگوں کو عرفانی سکون اور الٰہی یقین فراہم کیا۔ اس کے برعکس بلھے شاہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور پنجاب کی مذہبی سخت گیری کے دور میں سامنے آئے، جہاں ان کی شاعری نے عوام کو سماجی جبر کے خلاف حوصلہ دیا اور مذہبی منافرت کے خلاف اتحاد کی راہ دکھائی۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ رومی اور بلھے شاہ کے ہاں عشق ایک ہی روحانی سرچشمہ رکھتا ہے، لیکن اس کے اظہار اور اثرات ان کے اپنے تاریخی، لسانی اور سماجی تناظر کے مطابق مختلف ہیں۔ رومی کا عشق ایک عرفانی اور مابعد الطبیعاتی کائنات کی کھوج ہے، جبکہ بلھے شاہ کا عشق زمینی حقیقتوں سے جڑا ہوا ایک انقلابی پیغام ہے۔

نتیجہ

صوفیانہ شاعری میں محبت کا تصور اسلامی روحانیت اور انسانی شعور کی گہرائیوں کو سمجھنے کا ایک منفرد زاویہ فراہم کرتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور بلھے شاہ، اگرچہ صدیوں اور خطوں کے فرق سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی شاعری میں عشق ایک ایسی ہمہ گیر قوت کے طور پر ابھرتا ہے جو خدا سے

قربت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ دونوں شعرا نے اپنے اپنے عہد کی فکری اور سماجی ضرورتوں کے مطابق عشق کو نہ صرف بیان کیا بلکہ اسے ایک ایسے آفاقی پیغام میں ڈھالا جو آج بھی زندہ و جاوید ہے۔

رومی کے ہاں عشق کا تصور زیادہ تر عرفانی اور مابعد الطبیعاتی ہے۔ ان کے نزدیک عشق ایک آگ ہے جو انسان کے نفس کو جلا کر فنا کی کیفیت میں ڈھال دیتا ہے اور بالآخر وحدت الوجود کے تجربے تک لے جاتا ہے۔ ان کا عشق عقل کی قید سے آزاد اور کائنات کی روحانی حقیقتوں تک رسائی کا راستہ ہے۔ یہ تصور قونیہ کے سلجوقی دور اور منگول حملوں کے خوفناک پس منظر میں پروان چڑھا، جہاں رومی کی شاعری نے انسان کو تسلی اور الوہی یقین عطا کیا (Schimmel, 1975؛ Chittick, 1983)۔

اس کے برعکس، بلھے شاہ کا عشق زمینی اور عوامی ہے۔ ان کی پنجابی کافیوں میں عشق مذہبی سخت گیری، ذات پات کے امتیاز اور سماجی جبر کے خلاف ایک بغاوت کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ بلھے شاہ کا عشق عام لوگوں کی زبان میں خدا تک رسائی کا ذریعہ ہے، جو نہ صرف وحدت الوجود کو بیان کرتا ہے بلکہ معاشرتی مساوات اور انسانیت پر زور دیتا ہے۔ ان کے اشعار ذات اور مذہب کی تقسیم کو توڑتے ہیں اور ایک ہمہ گیر انسان دوستی کی وکالت کرتے ہیں (Puri & Shangari, 1986؛ Shackle, 2012)۔

یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ رومی اور بلھے شاہ دونوں نے عشق کو خدا کی تلاش اور انسان کی تکمیل کا بنیادی وسیلہ قرار دیا۔ تاہم، دونوں کا انداز اور مقصد ان کے معاشرتی و تاریخی پس منظر کے مطابق مختلف رہا۔ رومی نے عشق کو ایک عرفانی اور مابعد الطبیعاتی ارتقاء کے طور پر دیکھا، جبکہ بلھے شاہ نے اسے معاشرتی عدل اور عوامی آزادی کی زبان بنایا۔

یہ تقابلی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ صوفیانہ شاعری میں محبت نہ صرف ایک روحانی تجربہ ہے بلکہ ایک سماجی اور ثقافتی مظہر بھی ہے۔ رومی کی شاعری انسان کو باطن میں جھانکنے اور خدا کی حقیقت کو سمجھنے پر ابھارتی ہے، جبکہ بلھے شاہ کی شاعری انسان کو خارجی جبر اور امتیازات کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ دونوں کے کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عشق ایک ایسی کائناتی قوت ہے جو ہر دور اور ہر خطے میں انسان کو خدا سے جوڑنے اور انسانیت کو ایک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مستقبل میں اس موضوع پر مزید تحقیق اس بات کو اجاگر کر سکتی ہے کہ کس طرح دیگر صوفی شعرا جیسے شاہ عبد اللطیف بھٹائی، حضرت بابا فرید، یا سلطان باہو نے محبت کے تصور کو اپنی مخصوص ثقافتی زبان میں ڈھالا۔ یہ تحقیق صوفیانہ شاعری کے عالمگیر پیغام اور بین المذاہب ہم آہنگی کے امکانات کو مزید وسعت دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

سفارشات

رومی اور بلھے شاہ کی صوفیانہ شاعری میں محبت کا تصور محض ایک ادبی یا روحانی مضمون نہیں بلکہ ایک ایسا فکری سرمایہ ہے جو آج کے دور میں بھی عملی افادیت رکھتا ہے۔ اس مطالعہ کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں تاکہ مختلف اسٹیک ہولڈرز اس پیغام سے استفادہ کر سکیں:

علمی و تحقیقی میدان کے لیے: جامعات اور تحقیقی اداروں کو چاہیے کہ صوفیانہ شاعری، خاص طور پر رومی اور بلھے شاہ کے کلام، کو نصاب اور تحقیقی منصوبوں میں مزید وسعت دیں۔ صوفیانہ محبت کے فلسفے کو تقابلی ادب، مذہبی علوم اور فلسفے کے تناظر میں پڑھایا جائے تاکہ طلبہ عشق کے روحانی اور سماجی دونوں پہلوؤں کو سمجھ سکیں۔ مزید برآں، بین الاقوامی سطح پر ایسے تحقیقی منصوبے شروع کیے جائیں جو رومی، بلھے شاہ اور دیگر صوفی شعرا کے کلام کو جدید ترجمہ اور تشریحات کے ذریعے دنیا تک پہنچائیں۔

سماجی اور ثقافتی میدان کے لیے: سماجی تنظیموں اور ثقافتی اداروں کو چاہیے کہ صوفیانہ محبت کے پیغام کو معاشرتی ہم آہنگی کے لیے استعمال کریں۔ رومی کی روحانی وحدت اور بلھے شاہ کی سماجی برابری کی تعلیمات کو بین المذاہب اور بین الثقافتی مکالمے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے معاشرے میں نفرت، تعصب اور عدم برداشت کے رجحانات کم کرنے میں مدد ملے گی۔ موسیقی، صوفیانہ مشاعرہ اور عوامی میلوں کے ذریعے اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک پہنچانا بھی ایک مؤثر ذریعہ ہو سکتا ہے۔

مذہبی و روحانی رہنماؤں کے لیے: علمائے کرام اور مذہبی رہنما رومی اور بلھے شاہ کی تعلیمات کو اپنے خطبات اور عوامی پیغام رسانی میں شامل کریں۔ یہ تعلیمات نہ صرف دین کی اصل روح یعنی محبت، رواداری اور انسان دوستی کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ جدید دور کے مذہبی انتہاپسندی کے رجحانات کا متوازن جواب بھی فراہم کر سکتی ہیں۔

حکومتی و پالیسی ساز اداروں کے لیے: ریاستی سطح پر صوفی ورثے کو قومی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے پالیسیوں میں شامل کیا جائے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صوفیانہ ادب کو بطور لازمی مطالعہ شامل کر کے نئی نسل کو محبت، امن اور رواداری کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر صوفی ورثے کو سفارت کاری اور ثقافتی روابط کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، تاکہ پاکستان اور خطے کے مثبت تشخص کو اجاگر کیا جا سکے۔

عالمی تناظر میں: عالمی سطح پر رومی اور بلھے شاہ کی محبت کی تعلیمات کو interfaith dialogue (بین المذاہب مکالمہ) اور peace studies (امن کے مطالعات) میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اس سے عالمی سطح پر صوفی ورثہ ایک ایسا متوازن بیانیہ فراہم کر سکتا ہے جو مختلف عقائد اور ثقافتوں کو جوڑنے میں معاون ہو۔

حواشی و حوالہ جات

چٹک، ولیم سی۔ (1983)۔ صوفی راستہ محبت کا نیویارک: اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک پریس۔

Chittick, W. C. (1983). Sufi raasta mohabbat ka. New York: State University of New York Press.

لیوس، فرینکلن ڈی۔ (2000)۔ رومی: ماضی و حال، مشرق و مغرب لندن: ون ورلڈ پبلیکیشنز۔

Lewis, F. D. (2000). Rumi: maazi o haal, mashriq o maghrib. London: Oneworld Publications.

پوری، جے۔ آر، اور شنگاری، آر۔ پی۔ (1986)۔ بلھے شاہ: پنجابی صوفی شاعر, نئی دہلی: رادھا سوامی سٹسنگ بیاس۔

Puri, J. R., & Shangari, R. P. (1986). Bulleh Shah: Panjabi sufi shaair. New Delhi: Radha Soami Satsang Beas.

شاکل، کرسٹوفر۔ (2012)۔ بلھے شاہ: پنجابی صوفی شاعری۔ نئی دہلی: پینگوئن بکس انڈیا۔

Shackle, C. (2012). Bulleh Shah: Panjabi sufi shaairi. New Delhi: Penguin Books India.

شِمل، این میری۔ (1975)۔ راز آلود جہتیں: اسلامی تصوف کی علامتی زبان, چیپل ہل: یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس۔

Schimmel, A. (1975). Raaz alood jehatain: Islami tasawwuf ki alamaati zuban. Chapel Hill: University of North Carolina Press.

سمتھ، مارگریٹ۔ (1928)۔ رابعہ: ایک صوفی خاتون کی زندگی اور تعلیمات. کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

Smith, M. (1928). Rabi‘a: aik sufi khatoon ki zindagi aur taleemat. Cambridge: Cambridge University Press.